ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

AIOU LIBRARY
aioulibrary.com

Name:

Registration No.:

Course Code: 417

Program: B.A. / Associate Degree

Semester: Autumn 2026

WhatsApp Orders: +92 324 5836626

ISLAMABAD ,ALLAMA IQBAL OPEN UNIVERSITY

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

کورس: مطالعہ پاکستان (417) • سطح: بی اے / ایسوسی ایٹ ڈگری

سمسٹر: خزاں 2026

امتحانی مشق نمبر 2 (کوڈ نمبر: 100)

SOLVED ASSIGNMENT GUIDE

(Reference &For Study)

نوٹ: یہ گائیڈ صرف مطالعے اور رہنمائی کے لیے تیار کی گئی ہے۔ طلبہ سے گزارش ہے کہ کورس کی کتاب کے متعلقہ یونٹس کو غور سے پڑھیں، مفہوم کو اچھی طرح سمجھیں اور پھر امتحانی مشق اپنے الفاظ میں لکھیں، کیونکہ نقل شدہ مواد پر یونیورسٹی کی مواد کی چوری (Plagiarism) پالیسی کے تحت کارروائی ہو سکتی ہے۔

AIOU LIBRARY aioulibrary.com

سوال نمبر 1: 1956 کے آئین کے اہم پہلو (20 نمبر)

سوال نمبر 1: 1956 کے آئین کے اہم پہلوؤں کی وضاحت کریں۔ (20)

تعارف

1956 کا آئین پاکستان کا پہلا باقاعدہ آئین تھا جو 23 مارچ 1956 کو نافذ ہوا اور اسی دن پاکستان برطانوی دولتِ مشترکہ کی ڈومینین حیثیت سے نکل کر باضابطہ اسلامی جمہوریہ پاکستان بن گیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد نو برس تک ملک 1935 کے ایکٹ کی ترمیم شدہ شکل کے تحت چلتا رہا اور آئین سازی کی سست رفتاری ملکی سیاست کا سب سے بڑا سوالیہ نشان بنی رہی۔ اس دوران دو آئین ساز اسمبلیاں بنیں، قراردادِ مقاصد 1949 منظور ہوئی، بنیادی اصولوں کی کمیٹی کی رپورٹیں آئیں، محمد علی بوگرہ کا فارمولا پیش ہوا اور اکتوبر

1954 میں گورنر جنرل ملک غلام محمد نے پہلی آئین ساز اسمبلی تحلیل کر دی، جس کے بعد دوسری آئین ساز اسمبلی نے بالآخر آئین تیار کیا۔ اس پس منظر میں 1956 کے آئین کا نفاذ بلاشبہ ایک تاریخی کامیابی تھا۔

تاہم اس آئین کی زندگی مختصر رہی؛ سات اکتوبر 1958 کو صدر اسکندر مرزا نے اسے منسوخ کر کے مارشل لا نافذ کر دیا۔ اس کے باوجود اس کے اہم پہلوؤں کا مطالعہ ضروری ہے کیونکہ اس نے وفاقی پارلیمانی نظام، اسلامی دفعات، بنیادی حقوق اور مشرقی و مغربی پاکستان کے درمیان برابری (parity) جیسے اصولوں کو پہلی بار ایک مکمل دستاویز میں جمع کیا اور بعد کے آئینوں، خصوصاً 1973 کے آئین، کے لیے فکری و ڈھانچاتی بنیاد فراہم کی۔ اس جواب میں پہلے آئین کے بڑے ادارہ جاتی پہلو بیان ہوں گے، پھر اسلامی دفعات، بنیادی حقوق اور زبان و صوبائی مسائل جیسی خصوصیات کی وضاحت کی جائے گی اور آخر میں اس کی کمزوریوں اور انجام کا تنقیدی جائزہ بھی پیش کیا جائے گا۔

آئین سازی کا پس منظر

آئین بننے میں تاخیر کی وجوہات میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان نمائندگی کا تناسب، صوبوں اور مرکز کے اختیارات، اردو بنگالی کا مسئلہ، اسلامی اور سیکولر رجحانات کا ٹکراؤ اور سیاست دانوں کی باہمی چپقلش شامل تھیں۔ 1953 کے محمد علی بوگرہ فارمولے نے دو ایوانی مقننہ کی ایسی ترکیب پیش کی جس میں دونوں حصوں کی برابری رکھی گئی تھی، مگر وہ بھی نافذ نہ ہو سکا۔ پھر مغربی پاکستان کے تمام صوبوں اور ریاستوں کو ملا کر ون یونٹ قائم کیا گیا (1955) تاکہ مغربی ونگ ایک انتظامی اکائی کی حیثیت سے مشرقی پاکستان کے برابر قرار پائے اور برابری کا اصول ممکن ہو جائے۔ اسی سیاسی سمجھوتے کی بنیاد پر دوسری آئین ساز اسمبلی نے جنوری 1956 میں آئین کا مسودہ مکمل کیا، گورنر جنرل اسکندر مرزا نے 2 مارچ 1956 کو اس کی توثیق کی اور 23 مارچ سے اس کا نفاذ ہو گیا۔

وفاقی پارلیمانی نظام اور ریاستی ڈھانچہ

1956 کے آئین کے تحت پاکستان کو ایک وفاق قرار دیا گیا جس میں مشرقی پاکستان اور ون یونٹ کی صورت میں مغربی پاکستان دو اکائیاں تھیں۔ طرزِ حکومت پارلیمانی تھا: صدر ریاست کا سربراہ ہوتا تھا مگر اصل انتظامی اختیارات وزیرِ اعظم اور اس کی کابینہ کے پاس تھے جو قومی اسمبلی کے سامنے اجتماعی طور پر جواب دہ تھی۔ صدر کا انتخاب ایک انتخابی کالج (قومی اسمبلی اور دونوں صوبائی اسمبلیوں) کے ذریعے پانچ سال کے لیے ہوتا تھا اور صدر کے لیے مسلمان ہونا شرط تھی۔ مقننہ ایک ایوانی تھی؛ قومی اسمبلی کے

ارکان کی تعداد 310 رکھی گئی جن میں 300 عام نشستیں اور 10 خواتین کی مخصوص نشستیں تھیں اور دونوں ونگوں کو 150، 150 نشستوں کی مکمل برابری دی گئی تاکہ آبادی میں اکثریت رکھنے والا مشرقی پاکستان اکیلے پورے نظام پر حاوی نہ ہو جائے۔

مرکز اور صوبوں کے درمیان اختیارات تین فہرستوں کے ذریعے تقسیم کیے گئے؛ وفاقی فہرست میں دفاع، خارجہ امور، کرنسی اور مواصلات جیسے بڑے موضوعات مرکز کو دیے گئے اور بقیہ اختیارات صوبوں کو ملے، جو 1935 کے ایکٹ کی نسبت ایک پیش رفت تھی۔ آئین میں نیا قانون بنانے اور ترمیم کے لیے قومی اسمبلی کی دو تہائی اکثریت درکار تھی اور ہنگامی اختیارات صدر کے پاس رکھے گئے، جن کے تحت وہ آئین کی بعض دفعات معطل کر کے صوبائی حکومت برطرف بھی کر سکتا تھا۔ انتخابات بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہونے تھے اور جداگانہ یا مشترکہ انتخاب کا پرانا مسئلہ عارضی طور پر اس طرح حل کیا گیا کہ مشرقی پاکستان میں مشترکہ اور مغربی پاکستان میں جداگانہ انتخاب رہے گا اور حتمی فیصلہ بعد میں ہو گا۔

جدول 1: 1956 کے آئین کی اہم خصوصیات ایک نظر میں

پہلو	تفصیل
ریاست کا نام	اسلامی جمہوریہ پاکستان
طرزِ حکومت	وفاقی، پارلیمانی؛ اصل اختیارات وزیرِ اعظم و کابینہ کے پاس
مقننہ	ایک ایوانی قومی اسمبلی؛ 310 ارکان (300 عام + 10 خواتین)، دونوں ونگوں میں برابری
سربراہِ ریاست	صدر؛ مسلمان ہونا شرط؛ مدت پانچ سال
اسلامی دفعات	قرآن و سنت سے متصادم قانون کی ممانعت؛ اسلامی تحقیقی ادارہ
قومی زبانیں	اردو اور بنگالی
نفاذ	23 مارچ 1956؛ منسوخی 7 اکتوبر 1958

اسلامی دفعات

آئین کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان رکھا گیا اور اس کا دیباچہ قرار دادِ مقاصد پر مبنی تھا، جس کے مطابق اقتدارِ اعلیٰ اللہ تعالیٰ کا ہے اور عوام کے منتخب نمائندے اسے ایک مقدس امانت کے طور پر استعمال کریں گے۔ آئین میں اعلان کیا گیا کہ کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا جو قرآن و سنت کے احکامات سے متصادم ہو اور موجودہ قوانین کو بھی اسلامی احکامات کے مطابق ڈھالنے کے لیے اقدامات کیے جائیں گے۔ اس مقصد کے لیے ایک اسلامی تحقیقی ادارہ (Islamic Research Institute) قائم کرنے کی دفعہ شامل کی گئی جو اسلامی طرزِ زندگی کی تعمیرِ نو میں مدد دے اور ایک کمیشن کے ذریعے قوانین کی اسلامی جانچ کا بندوبست بھی تجویز ہوا۔

دیگر اسلامی دفعات میں صدر کا مسلمان ہونا، مسلمانوں کے لیے قرآن مجید کی تعلیم کی سہولت، زکوٰۃ، اوقاف اور مساجد کے انتظام سے متعلق سفارشات اور شراب نوشی و جوئے جیسی برائیوں کے خلاف قانون سازی کی ترغیب شامل تھیں۔ تاہم تنقیدی نظر سے دیکھا جائے تو ان دفعات کی بڑی کمزوری یہ تھی کہ ان کا بڑا حصہ راہنما اصولوں (directive principles) کی حیثیت رکھتا تھا، عدالت میں قابلِ نفاذ نہیں تھا، اور یہ تعین بھی آئین نے واضح نہیں کیا تھا کہ کسی قانون کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کا حتمی فیصلہ کون کرے گا؛ یہی ابہام بعد کے آئینوں میں بھی بحث کا موضوع بنا رہا۔ بہر حال یہ دفعات اس جدوجہد کی کامیابی تھیں جو عوام نے پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے تصور سے وابستہ رکھی تھی اور قرار دادِ مقاصد کے بعد یہ دوسرا بڑا آئینی قدم تھا۔

بنیادی حقوق، عدلیہ اور زبان کا مسئلہ

آئین میں شہریوں کے بنیادی حقوق باقاعدہ درج کیے گئے، جن میں قانون کی نظر میں برابری، شخصی آزادی کا تحفظ، اظہارِ رائے، اجتماع اور انجمن سازی کی آزادی، مذہب پر عمل کی آزادی، جائیداد کا حق اور ملازمتوں میں عدم امتیاز شامل تھے، اور ان حقوق کے نفاذ کے لیے شہری عدالتِ عالیہ اور عدالتِ عظمیٰ سے رجوع کر سکتا تھا۔ عدلیہ کو آزادی دینے کے لیے سپریم کورٹ کو آئین کی محافظ حیثیت دی گئی، ججوں کے تقرر اور مدتِ ملازمت کے تحفظ کا بندوبست کیا گیا اور دونوں ونگوں میں ہائی کورٹیں قائم رکھی گئیں، ڈھاکہ ہائی کورٹ اور لاہور ہائی کورٹ اسی ڈھانچے کا حصہ تھیں۔

زبان کے مسئلے پر آئین نے وہ سمجھوتا درج کیا جو برسوں کے احتجاج اور 1952 کی زبان کی تحریک و شہادتوں کے بعد طے پایا تھا: اردو اور بنگالی دونوں کو قومی زبانیں قرار دیا گیا، تاہم سرکاری مقاصد کے لیے انگریزی بیس سال تک جاری رہنے کی گنجائش رکھی گئی اور صوبائی اسمبلیوں کو اپنی علاقائی زبانوں کی ترویج کا اختیار دیا گیا۔ یہ دفعہ مشرقی پاکستان کے عوام کی بڑی کامیابی تھی اور اس سے لسانی اعتبار سے وفاق کی دونوں اکائیوں کو برابر کی عزت ملی۔ اسی طرح آئین نے دونوں ونگوں کے درمیان معاشی برابری کے لیے اقدامات، پس ماندہ علاقوں کی ترقی اور وفاقی ملازمتوں میں منصفانہ نمائندگی جیسے اصول بھی درج کیے، اگرچہ ان پر عمل درآمد کمزور رہا۔

کمزوریاں اور انجام

اس آئین کی نمایاں کمزوریوں میں پہلی کمزوری اس کا پیچیدہ اور سمجھوتوں سے بھرا ہونا تھا؛ برابری اور ویٹو پوائنٹ جیسے بندوبست مصنوعی تھے اور عوامی خواہشات کی اصل عکاسی نہیں کرتے تھے۔ دوسری کمزوری صدر کے ہنگامی اختیارات تھے جن سے پارلیمانی نظام کا توازن بگڑ سکتا تھا۔ تیسری کمزوری یہ کہ آئین کئی بڑے سوالات، جیسے انتخاب کے طریقے، کو مؤخر کر کے بنایا گیا تھا۔ چوتھی کمزوری اس کی سیاسی عمر تھی: صرف ڈھائی سال میں سیاست دانوں کی باہمی کشمکش، وزارتوں کی جلد جلد تبدیلی اور مشرقی پاکستان میں وفاق سے بڑھتی بد دلی نے آئین کو سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا اور بالآخر 7 اکتوبر 1958 کو صدر اسکندر مرزا نے اسے منسوخ کر کے مارشل لا لگا دیا، جس کے چند ہفتے بعد جنرل ایوب خان اقتدار پر قابض ہو گئے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ 1956 کا آئین خامیوں کے باوجود پاکستانی آئینیت کی بنیاد تھا: اس نے وفاقی پارلیمانی نظام، برابری کی بنیاد پر ایک ایوانی مقننہ، اسلامی دفعات، قابلِ نفاذ بنیادی حقوق، آزاد عدلیہ اور دو قومی زبانوں کے اصول کو پہلی بار ایک جامع دستاویز کی صورت دی۔ اس کا انجام اس بات کی تلخ مثال ہے کہ آئین صرف تحریر سے نہیں بلکہ آئین پر عمل کرنے والے سیاسی کلچر سے زندہ رہتا ہے۔ اسی لیے آج جب ہم اس آئین کے اہم پہلوؤں کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں اس کی دفعات کے ساتھ وہ سیاسی حالات بھی یاد رکھنے چاہئیں جنہوں نے اتنی بڑی دستاویز کو ڈھائی سال میں تاریخ کا حصہ بنا دیا، اور یہی سبق بعد کی آئین سازی میں سب سے زیادہ کام آیا۔

سوال نمبر2: پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں تبدیلیاں(20 نمبر)

سوال نمبر2: پاکستان اور امریکہ کے تعلقات میں تبدیلیوں کا جائزہ کریں۔(20)

تعارف

پاکستان اور امریکہ کے تعلقات کو ماہرین عموماً اتار چڑھاؤ کی تاریخ قرار دیتے ہیں؛ یہ تعلقات کبھی قریبی حکمتِ عملی اتحاد کی صورت اختیار کر لیتے ہیں اور کبھی سرد مہری، پابندیوں اور باہمی بے اعتمادی میں بدل جاتے ہیں۔ آزادی کے وقت پاکستان ایک نو آبادیشت، لاکھوں مہاجرین اور بھارت سے کشیدگی جیسے مسائل میں گھرا ہوا نوزائیدہ ملک تھا، جبکہ امریکہ دوسری جنگ عظیم کے بعد دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے طور پر سرد جنگ میں سوویت یونین کے خلاف اتحادی تلاش کر رہا تھا۔ انہی باہمی ضرورتوں نے دونوں کو ایک دوسرے کے قریب کیا، مگر جیسے ہی ضرورت ختم ہوئی یا ترجیحات بدلیں، تعلقات بھی بدلتے گئے۔ اس سوال کے جواب میں ان تعلقات کو اہم ادوار میں تقسیم کر کے ہر دور کی تبدیلی اور اس کے اسباب کا جائزہ لیا جائے گا۔

جائزے سے قبل یہ اصول ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ان تعلقات کی بنیاد ہمیشہ سیکیورٹی رہی، معاشی یا عوامی نہیں؛ پاکستان نے امریکہ سے زیادہ تر دفاعی تحفظ اور بھارت کے مقابل توازن چاہا، جبکہ امریکہ نے پاکستان کو اپنے عالمی مخالف کے خلاف محاذ کے طور پر دیکھا۔ جب بھی دونوں کے خطے کے دشمن کی تعریف مختلف ہوئی، تعلقات بگڑ گئے؛ پاکستان کا مرکز بھارت رہا اور امریکہ کا مرکز پہلے سوویت یونین، پھر دہشت گردی اور بعد میں چین رہا۔ یہی اختلاف تعلقات کے تمام اتار چڑھاؤ کی جڑ ہے اور ہر دور میں کسی نہ کسی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔

ابتدائی دور: 1947 تا 1953

قیامِ پاکستان کے بعد امریکہ نے پاکستان کو تسلیم کیا اور ابتدائی سالوں میں تعلقات دوستانہ مگر محدود رہے۔ وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کا مئی 1950 کا دورہ امریکہ اس دور کا نمایاں واقعہ تھا؛ انہوں نے سوویت یونین کی دعوت کے بجائے امریکہ جانے کو ترجیح دی، جسے مغربی دنیا سے پاکستان کی وابستگی کی علامت سمجھا گیا۔ لیاقت علی خان نے امریکہ

میں یہ واضح کیا کہ پاکستان کسی بلاک کا آلہ نہیں بنے گا بلکہ اپنے قومی مفاد کے مطابق فیصلے کرے گا، چنانچہ اس دور میں پاکستان نے فوجی اتحاد میں شامل ہوئے بغیر امریکہ سے دوستانہ تعلقات اور محدود معاشی تعاون حاصل کیا۔

اسی دور میں دونوں کے درمیان کشمیر کے مسئلے پر توقعات مختلف ہو گئیں؛ پاکستان کو امید تھی کہ امریکہ اقوامِ متحدہ میں حقِ خود ارادیت کی حمایت سے آگے بڑھ کر بھارت پر دباؤ ڈالے گا، مگر امریکی پالیسی متوازن رہی۔ اس کے باوجود سرد جنگ کی شدت اور کوریا کی جنگ جیسے واقعات نے امریکہ کو جنوبی ایشیا میں اتحادیوں کی تلاش پر مجبور کیا اور پاکستان، جو سوویت یونین اور چین کی سرحدوں کے قریب واقع تھا، اس کے لیے جغرافیائی اعتبار سے اہم بن گیا۔ یوں 1953 تک وہ زمین تیار ہو چکی تھی جس پر اگلے دور کا باضابطہ فوجی اتحاد کھڑا ہوا۔

جدول 1: پاک امریکہ تعلقات کے اہم ادوار ایک نظر میں

دور	خصوصیت	نمایاں واقعہ / نتیجہ
1947 تا 1953	ابتدائی دوستی	لیاقت علی خان کا دورہ امریکہ 1950
1954 تا 1965	باضابطہ فوجی اتحاد	سیٹو و سینٹو کی رکنیت؛ بڑی فوجی امداد
1965 تا 1979	زوال اور فاصلہ	1965 کی پابندیاں؛ چین سے قربت؛ ایٹمی اختلاف
1979 تا 1989	افغان جنگ کا اتحاد	فرنٹ لائن ریاست کا کردار؛ وسیع امداد
1990 تا 2001	پابندیاں	پریسلر ترمیم؛ 1998 کے بعد اقتصادی پابندیاں
2001 تا 2021	دہشت گردی کے خلاف اتحاد	غیر نیٹو اہم اتحادی کا درجہ؛ سلالہ و ایبٹ آباد بحران
2021 کے بعد	محدود شراکت	تجارت و صحت پر توجہ؛ انخلا کے بعد نئی صورتحال

اتحاد کا دور: 1954 تا 1965

1954 میں پاکستان اور امریکہ کے درمیان باہمی دفاعی امداد کا معاہدہ ہوا، اسی سال پاکستان سیٹو (SEATO) کا رکن بنا اور 1955 میں بغداد معاہدے (بعد میں سینٹو) میں شامل ہوا، جس کے بعد اسے امریکہ کا سب سے زیادہ اتحادی (اتحادی) کہا جانے لگا۔ اس دور میں پاکستان کو بڑی مقدار میں فوجی امداد ملی، جدید طیارے اور ٹینک ملے، فوجی اڈوں کی سہولتیں دی گئیں اور پشاور کے قریب واقع اڈے سے امریکی جاسوس طیارے کی پرواز (1960 کا یو ٹو واقعہ) نے پاکستان کو سوویت غصے کا نشانہ بھی بنایا۔ صدر ایوب خان کا 1961 کا دورہ امریکہ اس دور کی قربت کی بلندی تھا اور امریکی امداد نے پاکستان کی دفاعی صلاحیت کے ساتھ معاشی ترقی میں بھی حصہ لیا۔

مگر یہ اتحاد دونوں کے لیے مختلف معنوں میں تھا: امریکہ کے نزدیک یہ معاہدے کمیونزم کے خلاف تھے اور بھارت سے جنگ کی صورت میں امداد کی کوئی ضمانت نہیں تھی، جبکہ پاکستان انہیں بھارت کے خلاف تحفظ سمجھتا تھا۔ 1962 کی چین بھارت جنگ کے بعد امریکہ نے بھارت کو بھی فوجی امداد دینی شروع کی تو پاکستان میں مایوسی پھیلی۔ 1965 کی پاک بھارت جنگ میں امریکہ نے دونوں ممالک پر اسلحے کی پابندی لگا دی، لیکن عملی نقصان پاکستان کو زیادہ ہوا کیونکہ اس کی فوج کا انحصار امریکی اسلحے پر تھا۔ یہ واقعہ تعلقات کا پہلا بڑا موڑ تھا جس نے پاکستانی پالیسی سازوں کو یہ سبق دیا کہ یہ اتحاد ضرورت کا ہے، اعتماد کا نہیں۔

زوال اور فاصلے کا دور: 1965 تا 1979

1965 کے بعد پاکستان نے چین سے قربت بڑھائی اور امریکہ سے فاصلہ اختیار کیا، تاہم 1971 میں ایک دلچسپ باب کھلا جب پاکستان نے امریکہ اور چین کے درمیان خفیہ رابطے کا ذریعہ بن کر ہینری کسنجر کے دورہ چین کی راہ ہموار کی؛ یہ خدمت صدر یحییٰ خان کے دور میں انجام پائی۔ مگر اسی سال مشرقی پاکستان کے بحران اور جنگ میں امریکہ پاکستان کی کوئی عملی مدد نہ کر سکا، اگرچہ اس نے خلیج بنگال میں اپنا بحری بیڑا بھیجا تھا۔ سقوطِ ڈھاکہ کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کے دور میں پاکستان سینٹو سے الگ ہونے کے قریب پہنچا، امریکہ سے تعلقات ایٹمی پروگرام پر اختلافات کی وجہ سے کشیدہ ہوئے اور 1979 میں امریکی سفارت خانے پر حملے کے واقعے نے تعلقات کو مزید نقصان پہنچایا۔

افغان جنگ کا احیا اور پھر پابندیاں: 1979 تا 2001

دسمبر 1979 میں افغانستان پر سوویت حملے نے تعلقات کو ایک بار پھر بلندی پر پہنچا دیا؛ جنرل ضیاء الحق کا پاکستان امریکہ کا فرنٹ لائن اتحادی بن گیا، اربوں ڈالر کی فوجی و معاشی امداد ملی، افغان مزاحمت کی حمایت کا پورا ڈھانچہ پاکستان کے ذریعے چلا اور ایٹمی مسئلے پر امریکہ نے چشم پوشی اختیار کی۔ لیکن جیسے ہی 1989 میں سوویت فوجیں افغانستان سے نکلیں، امریکہ کی دلچسپی ختم ہو گئی؛ 1990 میں پریسلر ترمیم کے تحت ایٹمی پروگرام کی بنیاد پر امداد بند کر دی گئی، ادا شدہ قیمت والے ایف سولہ طیارے بھی روک لیے گئے اور پاکستان میں اس رویے کو استعمال کر کے چھوڑ دینے کی پالیسی قرار دیا گیا۔

1990 کی دہائی سرد مہری کا دور تھا؛ کشمیر اور ایٹمی مسائل پر دباؤ بڑھا اور مئی 1998 کے ایٹمی دھماکوں کے بعد پاکستان پر مزید اقتصادی پابندیاں لگ گئیں۔ اس پورے عرصے میں امریکی پالیسی کا مرکز سرد جنگ کے بعد بھارت کی بڑی منڈی اور ابھرتی طاقت کی طرف منتقل ہو رہا تھا، جس کے ساتھ کا توازن بھی بدل رہا تھا۔ تعلقات کی یہ سرد ی اس بات کا ثبوت تھی کہ جب کوئی مشترکہ خطرہ موجود نہ ہو تو دونوں ممالک کے مفادات بڑی حد تک الگ ہو جاتے ہیں اور اختلافات سامنے آ جاتے ہیں۔

نائن الیون کے بعد کا دور اور حالیہ صورتحال

گیارہ ستمبر 2001 کے حملوں کے بعد تعلقات میں ایک اور بڑی تبدیلی آئی؛ پاکستان ایک بار پھر امریکہ کا اہم اتحادی بن گیا، پابندیاں اٹھا لی گئیں، پاکستان کو غیر نیٹو اہم اتحادی (Major Non-NATO Ally) کا درجہ ملا اور اربوں ڈالر کی امداد اور فوجی تعاون کا سلسلہ چلا۔ لیکن یہ دور باہمی شکوک سے بھی بھرا رہا: ڈرون حملوں، 2011 میں ایبٹ آباد آپریشن اور سلالہ چیک پوسٹ پر حملے جیسے واقعات نے تعلقات کو بار بار بحران میں ڈالا اور پاکستانی عوام میں امریکہ مخالف جذبات بڑھتے رہے۔ کیری لوگر بل کے ذریعے سویلین امداد کی کوشش بھی ہوئی مگر اس کی شرائط پر پاکستان میں تنقید ہوئی۔

افغانستان سے امریکی انخلا (2021) کے بعد تعلقات محدود اور محتاط ہو گئے ہیں؛ اب ان کا مرکز تجارت، تعلیم، صحت اور محدود سیکیورٹی تعاون رہ گیا ہے، جبکہ امریکہ کی بھارت سے بڑھتی قربت اور پاکستان کی چین سے گہری شراکت داری (سی پیک) نے خطے کی صف بندی بدل دی ہے۔ تجزیہ کاروں کے مطابق مستقبل کے تعلقات کسی بڑے

اتحاد کے بجائے مفادات پر مبنی محدود شراکت کی صورت میں رہیں گے۔ یہ پورا سفر اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ پاک امریکہ تعلقات جذبات پر نہیں، بدلتی ہوئی جغرافیائی سیاست پر چلتے آئے ہیں۔

تعلقات میں تبدیلیوں کے اسباب کا تجزیہ

ان تبدیلیوں کے اسباب کا جائزہ لیا جائے تو تین بڑے عوامل سامنے آتے ہیں۔ پہلا عامل عالمی سیاست کی تبدیلی ہے: سرد جنگ، اس کا خاتمہ، پھر دہشت گردی کے خلاف جنگ اور اس کے بعد چین کا ابھار؛ ہر نئے عالمی مرحلے نے پاکستان کی اہمیت کو امریکہ کی نظر میں نئے سرے سے متعین کیا۔ دوسرا عامل ترجیحات کا اختلاف ہے؛ پاکستان کے لیے اصل خطرہ ہمیشہ بھارت اور کشمیر رہا جبکہ امریکہ کے لیے خطے سے بڑے عالمی مسائل اہم رہے، اس لیے جب بھی پاک بھارت جنگ چھڑی، امریکی بے عملی پاکستان کے لیے مایوسی کا باعث بنی۔ تیسرا عامل داخلی سیاست اور عوامی رائے ہے؛ دونوں ممالک میں قیادت کی تبدیلی، پریس اور عوامی ماحول نے بھی تعلقات کو متاثر کیا۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ پاک امریکہ تعلقات ابتدا سے آج تک ایک ہی لکیر پر نہیں چلے بلکہ ادوار میں بٹے رہے ہیں: ابتدائی دوستی (1947 تا 1953)، باضابطہ اتحاد (1954 تا 1965)، زوال (1965 تا 1979)، افغان جنگ کا احیا (1979 تا 1989)، پابندیوں اور سرد مہری کا دور (1990 تا 2001)، نائن الیون کے بعد کا کشیدہ اتحاد (2001 تا 2021) اور اس کے بعد محدود شراکت۔ ہر تبدیلی کی جڑ سیکیورٹی ضرورتوں کا میل یا اختلاف تھا۔ اس جائزے سے طالب علم کے لیے سبق یہ ہے کہ خارجہ تعلقات میں مستقل دوستی یا دشمنی نہیں ہوتی، مستقل صرف قومی مفادات ہوتے ہیں؛ پاکستان کے لیے پائیدار راستہ یہی ہے کہ وہ کسی ایک طاقت پر انحصار کے بجائے متوازن تعلقات اور معاشی خود کفالت کو اپنی خارجہ پالیسی کی بنیاد بنائے۔

سوال نمبر 3: نوزائیدہ مملکتِ پاکستان کو درپیش مسائل (20 نمبر)

سوال نمبر 3: نوزائیدہ مملکتِ پاکستان کو درپیش مسائل پر تفصیلاً بحث کریں۔ (20)

تعارف

14 اگست 1947 کو پاکستان دنیا کے نقشے پر ایک آزاد ریاست کے طور پر ابھرا، لیکن یہ آزادی ان گنت مسائل کے ساتھ آئی۔ برعکس بھارت کے، جسے تیار انتظامی مشینری، دارالحکومت، خزانہ اور صنعتی ڈھانچہ ورثے میں مل گیا تھا، پاکستان کو سب کچھ صفر سے شروع کرنا تھا: نہ مرکزی سیکرٹریٹ تھا، نہ خزانے میں خاطر خواہ رقم، نہ منظم فوج، نہ ہی صنعت و تجارت کا مضبوط نظام۔ اس کے ساتھ لاکھوں مہاجرین کی آمد، فرقہ وارانہ فسادات، ریاستوں کے الحاق کے تنازعات اور نہری پانی کی بندش جیسے مسائل نے نوزائیدہ مملکت کی بقا کو ہی سوالیہ بنا دیا تھا۔ بہت سے غیر ملکی مبصر تو یہ پیش گوئی کر رہے تھے کہ یہ ریاست چند ماہ سے زیادہ نہیں چل سکے گی۔

اس سوال میں انہی مسائل پر تفصیلاً بحث کی جائے گی، جنہیں انتظامی و حکومتی، مہاجرین و سماجی، مالی و معاشی، دفاعی و بیرونی اور آئینی و سیاسی خانوں میں تقسیم کر کے سمجھا جا سکتا ہے۔ بحث کا مقصد صرف مسائل گنوانا نہیں بلکہ یہ بھی سمجھنا ہے کہ ان کی نوعیت اتنی سنگین کیوں تھی اور قائداعظم اور ان کی ٹیم نے کن حالات میں ریاست کو سنبھالا دیا۔ یہ مسائل اس لیے بھی اہم ہیں کہ ان کے اثرات پاکستان کی بعد کی سیاست، معیشت اور اداروں پر دہائیوں تک مرتب ہوتے رہے، مثلاً فوج اور بیوروکریسی کی نسبتاً مضبوطی اور آئین سازی کی تاخیر جیسے رجحانات کی جڑیں اسی ابتدائی بحران میں ملتی ہیں۔

انتظامی و حکومتی مسائل

سب سے پہلا مسئلہ حکومت کے قیام کا تھا۔ کراچی کو عارضی دارالحکومت منتخب کیا گیا مگر وہاں وفاقی حکومت کے دفاتر اور ملازمین کی رہائش کی گنجائش موجود نہیں تھی؛ چھتوں اور عارضی جھونپڑی نما دفاتر میں سیکرٹریٹ قائم ہوا اور کئی وزارتوں نے لکڑی کے بیرکوں سے کام شروع کیا۔ انڈین سول سروس اور دیگر مرکزی سروسز کے افسران کی بڑی اکثریت بھارت کے حصے میں گئی؛ پاکستان کے حصے میں آنے والے افسر محدود تعداد میں تھے اور تجربہ کار سیکرٹری سطح کے افسر نہایت کم تھے۔ دہلی سے فائلیں، ریکارڈ اور دفتری سامان تک مکمل طور پر منتقل نہ ہو سکا، اس لیے کئی محکمے بغیر ریکارڈ کے نئے سرے سے کام کرنے پر مجبور تھے۔

انتظامی مسئلے کا دوسرا پہلو عملے اور سامان کی منتقلی میں رکاوٹیں تھیں۔ پاکستان کا انتخاب کرنے والے سرکاری ملازمین کو بھارت سے آنے میں مشکلات پیش آئیں اور بعض جگہ ان کی جائیداد اور سامان روک لیا گیا۔ ریلوے، ڈاک و تار اور ٹیلی فون کا نظام تقسیم کی وجہ سے منتشر ہو چکا تھا؛ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان براہِ راست رابطے کا کوئی زمینی

راستہ موجود نہیں تھا اور سمندری و فضائی رابطہ بھی محدود تھا۔ اس کے باوجود نئی بیوروکریسی نے دن رات کام کر کے ریاستی ڈھانچے کو کھڑا کیا اور قائداعظم کی براہِ راست نگرانی میں کراچی میں وفاقی حکومت کا نظم قائم ہو گیا، تاہم افسران کی کمی نے آئندہ برسوں میں بیوروکریسی کو سیاست میں غیر معمولی اہمیت دے دی، جو آگے چل کر ملکی سیاست کے توازن پر دور رس اثر ثابت ہوئی۔

مہاجرین اور فسادات کا مسئلہ

تقسیم کے ساتھ انسانی تاریخ کی سب سے بڑی نقل مکانی شروع ہوئی؛ تقریباً ستر لاکھ سے زائد مسلمان مہاجر بھارت سے پاکستان آئے اور لاکھوں غیر مسلم یہاں سے بھارت گئے۔ مغربی پاکستان میں آنے والے مہاجرین کی تعداد صوبہ پنجاب اور سندھ کی آبادی کے نمایاں حصے کے برابر تھی۔ ان بے گھر خاندانوں کے لیے خوراک، رہائش، پینے کا پانی، علاج اور روزگار کا فوری بندوبست کرنا کسی بھی مضبوط ریاست کے لیے چیلنج ہوتا، پاکستان کے کمزور وسائل کے لیے یہ بوجھ ناممکن کام تھا۔ مہاجر کیمپوں میں وبائیں پھوٹنے کا خطرہ، صفائی کے ناقص انتظامات اور سردی سے پہلے خیموں کا مسئلہ مسلسل سر اٹھائے رہا۔ حکومت نے اعلیٰ سطحی جنسی کمیٹی قائم کی، مہاجرین کی آبادکاری کے لیے غیر مسلموں کی چھوڑی ہوئی (evacuee) جائیدادیں تقسیم کی گئیں اور مقامی آبادی نے عمومی طور پر مہاجرین کو اپنے گھروں میں جگہ دے کر تاریخی جذبے کا مظاہرہ کیا۔

اس مسئلے سے جڑا دوسرا پہلو فرقہ وارانہ فسادات تھے، خصوصاً پنجاب میں قتل و غارت نے ریل گاڑیوں اور قافلوں کو لہولہان کر دیا۔ امن و امان کی بحالی کے لیے کم تعداد فوج اور پولیس کو مسلسل تعینات رکھنا پڑا۔ مہاجرین کی آبادکاری صرف عارضی امداد کا نام نہیں تھا؛ ان کی مستقل بحالی، بچوں کی تعلیم، کسان مہاجرین کو زمین کی الاٹمنٹ اور شہری مہاجرین کو کاریگری و تجارت کے مواقع دینا دہائیوں پر محیط عمل ثابت ہوا۔ اس انسانی المیے نے پاکستان کے سماجی ڈھانچے کو ہمیشہ کے لیے بدل دیا اور اردو بولنے والے مہاجرین کی کراچی و حیدرآباد میں آبادکاری آگے چل کر لسانی و سیاسی مسائل کی بنیاد بھی بنی، مگر ابتدائی دنوں میں ریاست اور عوام کی مشترکہ قربانی نے اس بحران کو مملکت کے خاتمے کا سبب نہیں بننے دیا۔

مالی، معاشی اور اثاثوں کی تقسیم کے مسائل

مالی اعتبار سے پاکستان خالی خزانے سے شروع ہوا۔ متحدہ ہند کے نقد اثاثوں میں پاکستان کا حصہ ساڑھے سات سو ملین روپے طے ہوا تھا مگر بھارت نے ابتدا میں صرف دو سو ملین روپے دیے اور بقیہ رقم اس وقت روک لی جب پاک بھارت تعلقات کشمیر پر کشیدہ ہوئے؛ بالآخر جنوری 1948 میں مہاتما گاندھی کی بھوک ہڑتال کے دباؤ پر بھارت نے پانچ سو پچاس ملین روپے ادا کیے۔ فوجی ساز و سامان، گولہ بارود اور آرڈننس فیکٹریوں کے حصے میں بھی پاکستان کے ساتھ ناانصافی ہوئی؛ طے شدہ حصہ مکمل نہ ملا اور پاکستان کی واحد بھی قابلِ ذکر آرڈننس سہولتیں محدود تھیں، جبکہ خطے میں جنگ کا خطرہ سر پر منڈلا رہا تھا۔ مرکز کے لیے بجٹ بنانا، تنخواہوں کی ادائیگی اور مہاجرین پر خرچ ایک ساتھ سنبھالنا خزانے پر غیر معمولی بوجھ تھا۔

معاشی ڈھانچے کی کمزوری اس سے بھی بڑا مسئلہ تھی۔ پاکستان کو خام مال پیدا کرنے والے علاقے ملے تھے؛ پاٹ (جوٹ) مشرقی بنگال میں پیدا ہوتا تھا مگر اس کی ملیں کلکتہ میں تھیں، کپاس مغربی پاکستان میں تھی مگر ٹیکسٹائل ملیں بھارت میں، یہاں تک کہ بینکوں اور بیمہ کمپنیوں کے صدر دفاتر بھی زیادہ تر بھارت میں رہ گئے۔ پاکستان کے حصے میں صنعتی اداروں کا حصہ نہایت کم آیا، بندرگاہ کے علاوہ کراچی کے سوا کوئی بڑی بندرگاہ موجود نہیں تھی اور چٹاگانگ بھی ترقی یافتہ نہیں تھی۔ اس کے اوپر اپریل 1948 میں بھارت نے نہری پانی بند کر کے زرعی معیشت کے لیے بقا کا خطرہ پیدا کر دیا، کیونکہ پاکستان کی بڑی نہریں بھارت کے علاقے سے نکلتی تھیں۔ یہ پانی کا تنازعہ بالآخر 1960 کے سندھ طاس معاہدے سے حل ہوا، مگر ابتدائی برسوں میں یہ پاکستان کی زراعت اور خارجہ پالیسی دونوں پر سایہ فگن رہا۔

ریاستوں کے الحاق، دفاع اور بیرونی مسائل

برطانوی ہند کی پانچ سو سے زائد ریاستوں کو یہ اختیار ملا تھا کہ وہ پاکستان یا بھارت میں سے کسی کے ساتھ الحاق کریں۔ جونا گڑھ کے مسلم نواب نے پاکستان سے الحاق کیا مگر بھارت نے اسے تسلیم کرنے کے بجائے فوجی قبضہ کر لیا؛ حیدرآباد دکن کی سب سے بڑی ریاست کو بھی بھارت نے 1948 میں فوجی کارروائی سے ملا لیا۔ سب سے سنگین تنازعہ کشمیر کا تھا: مسلم اکثریتی ریاست کے ہندو مہاراجہ نے پاکستان کے ساتھ کئی معاہدے (ementstandstill agre) کے باوجود بھارت سے الحاق کا اعلان کیا، جس کے خلاف کشمیری

عوام اور قبائل کی جدوجہد شروع ہوئی اور پھر باقاعدہ پاک بھارت جنگ چھڑ گئی جو یکم جنوری 1949 کو اقوامِ متحدہ کی جنگ بندی سے رکی۔ کشمیر کا یہ مسئلہ پاکستان کی دفاعی اور خارجہ پالیسی کا مستقل مرکز بن گیا اور نوزائیدہ مملکت کو اپنی محدود فوج کا غیر معمولی حصہ سرحدوں پر رکھنا پڑا۔

دفاعی لحاظ سے پاکستان کی مشکلات کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اسے ایک ایسی فوج ملی جس کی تنظیمِ نو ابھی جاری تھی، افسروں کی کمی تھی اور جس کے پاس اپنے حصے کا اسلحہ تک مکمل نہیں پہنچا تھا؛ ابتدائی برسوں میں برطانوی افسر ہی بڑی تعداد میں اعلیٰ عہدوں پر خدمات انجام دیتے رہے۔ مغرب میں افغانستان نے پاکستان کے اقوامِ متحدہ میں داخلے کے خلاف ووٹ دیا اور درّہ سرحد (ڈیورنڈ لائن) پر دعویٰ برقرار رکھا، بلوچستان کے ساتھ قلات کے الحاق کا معاملہ بھی طے طلب رہا جو 1948 میں حل ہوا۔ یوں نئی ریاست کو بیک وقت مشرق میں بھارت، مغرب میں افغانستان اور اندرونِ ملک سیکیورٹی کے تین محاذ سنبھالنے پڑے جو اس کے بجٹ کا بڑا حصہ دفاع کی طرف لے گئے۔

آئینی، سیاسی اور جغرافیائی مسائل

پاکستان کو اپنا آئین خود بنانا تھا، مگر آئین ساز اسمبلی بیک وقت مقننہ کا کام بھی کر رہی تھی اور 1935 کا ایکٹ عبوری ڈھانچے کے طور پر نافذ تھا۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان نمائندگی، اختیارات اور وسائل کی تقسیم پر اختلافات نے آئین سازی کو طویل کر دیا اور یہ تاخیر آگے چل کر سیاسی عدم استحکام کی مستقل وجہ بنی۔ جغرافیائی اعتبار سے ملک کے دو حصے ایک دوسرے سے تقریباً سولہ سو کلو میٹر بھارتی سرزمین سے جدا تھے؛ آبادی میں اکثریت مشرق میں تھی اور وفاقی دارالحکومت و معاشی مرکز مغرب میں، یہ غیر معمولی جغرافیہ قومی یکجہتی کے لیے مسلسل امتحان رہا۔ صوبائی و لسانی تنوع بھی ایک حقیقت تھا؛ سندھی، پنجابی، پشتون، بلوچ اور بنگالی شناختوں کو ایک قومی دھارے میں لانا قیادت کے لیے بڑا کام تھا۔

ان سب بحرانوں کے عین درمیان ستمبر 1948 میں قائداعظم کی رحلت نے قوم کو اس کی سب سے بڑی قیادت سے محروم کر دیا اور اکتوبر 1951 میں وزیراعظم لیاقت علی خان کی شہادت نے سیاسی خلا کو مزید گہرا کر دیا۔ ادارہ جاتی تسلسل رکھنے والی کوئی بڑی سیاسی تنظیم بھی مضبوط نہ تھی، کیونکہ مسلم لیگ تحریک کی جماعت تھی، حکومتی مشینری چلانے کا اس کا تجربہ محدود تھا۔ ان حالات نے بیوروکریسی اور فوج کو حکومتی فیصلوں میں غیر معمولی وزن دے دیا۔ یوں ابتدائی مسائل صرف وقتی مشکلات نہیں تھے بلکہ انہوں

نے پاکستان کے سیاسی نظام کی آئندہ سمت کا تعین کیا؛ ان کا درست مطالعہ ہی ہمیں بعد کی تاریخ سمجھنے کی کنجی دیتا ہے۔ اس کے باوجود یہ سچ ہے کہ اتنے مسائل کے باوجود ریاست قائم رہی، نظام چلا اور لاکھوں مہاجرین آباد ہوئے، جو قیادت اور عوام دونوں کی استقامت کا ثبوت ہے۔

نتیجہ

خلاصہ یہ ہے کہ نوزائیدہ مملکتِ پاکستان کو درپیش مسائل بیک وقت انتظامی، مالی، معاشی، دفاعی، سماجی اور آئینی نوعیت کے تھے: حکومت کا ڈھانچہ نہ ہونا، خزانہ خالی ہونا، مہاجرین کا سیلاب، نہری پانی کی بندش، اثاثوں کی ناقص تقسیم، کشمیر سمیت الحاق کے تنازعات، دو حصوں میں بٹی جغرافیائی حیثیت اور قیادت کا جلد بچھڑ جانا۔ ان میں سے بعض مسائل فوری کوششوں سے قابو میں آ گئے، مثلاً حکومت کا قیام اور مہاجرین کی ابتدائی آبادکاری، جبکہ کشمیر، پانی اور آئین سازی جیسے مسائل طویل عرصہ لیتے رہے۔ ان مسائل کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ پاکستان محض جغرافیے کا نام نہیں بلکہ ایک ایسی ریاست ہے جو بحرانوں میں پیدا ہوئی اور بحرانوں سے لڑ کر زندہ رہی؛ اسی استقامت کو سمجھنا ہر طالب علم کے لیے تحریکِ پاکستان کے مطالعے کی تکمیل ہے۔

سوال نمبر 4: ترقی پسند مصنفین کے نقطۂ نظر پر تبصرہ (20 نمبر)

سوال نمبر 4: ترقی پسند مصنفین کے نقطۂ نظر پر تبصرہ کریں۔ (20)

تعارف

ترقی پسند تحریک بیسویں صدی کے برصغیر کی سب سے مؤثر ادبی تحریک تھی جس نے اردو ادب کا رخ ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ اس تحریک سے وابستہ مصنفین کو ترقی پسند مصنفین کہا جاتا ہے اور ان کا بنیادی نعرہ تھا: ادب برائے زندگی، یعنی ادب زندگی کا آئینہ بھی ہو اور اس کی اصلاح کا ذریعہ بھی۔ ان کے نزدیک ادب محض تخیل کی رنگینی، بادشاہوں کی مدح یا ذاتی جذبات کی ترجمانی نہیں بلکہ سماج کی حقیقتوں، خصوصاً غریب، مزدور، کسان اور پسے ہوئے طبقات کی زندگی، کو پیش کرنے اور ان میں شعور پیدا کرنے کا نام ہے۔ اس نقطۂ نظر کی بنیاد مارکسی فکر، روسی انقلاب کے اثرات اور برصغیر کی نوآبادیاتی و جاگیردارانہ صورتحال پر رکھی گئی تھی۔

اس تحریک کا باقاعدہ آغاز عام طور پر 1936 میں لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس سے مانا جاتا ہے جس کی صدارت منشی پریم چند نے کی تھی، جبکہ اس سے پہلے 1932 میں انگارے نامی افسانوی مجموعے نے اور 1935 میں لندن میں تیار ہونے والے منشور نے اس کی زمین تیار کر دی تھی۔ اس جواب میں ترقی پسند مصنفین کے نقطۂ نظر کے بنیادی عناصر بیان کیے جائیں گے اور پھر ایک متوازن تبصرہ پیش کیا جائے گا جس میں اس فکر کی خوبیاں بھی ہوں گی اور اس پر ہونے والی تنقید بھی، کیونکہ یہ سوال محض تعریف نہیں بلکہ جائزے اور تبصرے کا تقاضا کرتا ہے۔

ترقی پسند نقطۂ نظر کے بنیادی عناصر

ترقی پسند فکر کا پہلا عنصر حقیقت نگاری (realism) ہے۔ ترقی پسند مصنف کے نزدیک ادب کو زندگی کی اصل صورت پیش کرنی چاہیے؛ بھوک، غربت، جہالت، ذات پات کی تقسیم، رسم و رواج کی جکڑ بندیاں اور استحصال وہ موضوعات ہیں جنہیں رومانوی ادب نظر انداز کرتا آیا تھا۔ ان کے مطابق ادیب کی سماجی ذمہ داری ہے، یعنی ادیب معاشرے سے لاتعلق تماشائی نہیں بلکہ اس کا حساس شہری ہے اور اس کی تحریر کو ترقی، انصاف اور انسانی وقار کی جدوجہد کا حصہ ہونا چاہیے۔ دی لیٹریچر آف انجمن کے منشور میں ملک کی سیاسی آزادی، معاشی انصاف اور پس ماندگی کے خاتمے کو ادب کے اہداف قرار دیا گیا تھا اور ہر اس رجحان کی مخالفت کی گئی تھی جو قوم کو جمود، مایوسی یا فراریت کی طرف لے جائے۔

تیسرا عنصر طبقاتی شعور ہے۔ ترقی پسند مصنفین سماج کو استحصال کرنے والوں اور استحصال کا شکار ہونے والوں میں منقسم دیکھتے تھے اور ان کے افسانوں و شاعری میں جاگیر دار، سرمایہ دار، مہاجن اور فرسودہ مذہبی اجارہ داری کو تنقید کا نشانہ بنایا گیا، جبکہ کسان، مزدور، مل مزدور، طوائف اور نچلے طبقے کی عورت پہلی بار ادب کے مرکزی کردار بنے۔ چوتھا عنصر سامراج و جاگیر داری کی مخالفت اور آزادی و جمہوریت کی حمایت تھا؛ ان کی تحریروں نے تحریکِ آزادی کو فکری تقویت دی۔ پانچواں عنصر بین الاقوامیت تھا، یعنی دنیا بھر کے مظلوموں سے یکجہتی اور امن کی حمایت۔ ان عناصر نے مل کر ایک ایسا ادبی مؤقف تشکیل دیا جسے فیض احمد فیض، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، عصمت چغتائی، سعادت حسن منٹو، احمد علی، قرۃ العین حیدر اور بہت سے دوسرے بڑے ناموں نے اپنے اپنے اسلوب میں آگے بڑھایا۔

اردو ادب پر ترقی پسند فکر کے مثبت اثرات

تبصرے کا آغاز اس اعتراف سے ہونا چاہیے کہ ترقی پسند تحریک نے اردو ادب کو موضوعات کی وسعت عطا کی جو اس سے پہلے موجود نہیں تھی۔ افسانہ دیوان خانوں اور رومانی ماحول سے نکل کر گاؤں کی جھونپڑی، مل کی چمنی، فٹ پاتھ اور ریڈ لائٹ ایریا تک پہنچا؛ کرشن چندر کے افسانوں میں کشمیر اور مزدوروں کی زندگی آئی، بیدی نے متوسط طبقے کے نفسیاتی و معاشی مسائل لکھے اور عصمت چغتائی نے عورت کے استحصال اور گھریلو جبر کو بے باکی سے پیش کیا۔ شاعری میں بھی فیض نے غزل کے روایتی حسن و عشق کے استعاروں کو سماجی معنوں سے بھر دیا، علی سردار جعفری اور جاں نثار اختر نے عوامی مسائل کو نظم کا موضوع بنایا اور احتجاجی شاعری ایک باقاعدہ صنفی طاقت بن گئی۔

دوسرا مثبت اثر زبان و اسلوب پر پڑا۔ عوامی زندگی کی نمائندگی نے ادب کو عام بول چال، علاقائی رنگ اور سادگی سے قریب کیا اور ثقیل و مصنوعی زبان کی گرفت کمزور ہوئی۔ تیسرا اثر ادبی تنقید پر پڑا؛ ادب کو سماجی دستاویز کے طور پر پرکھنے کا معیار قائم ہوا اور احمد علی و دیگر نقادوں نے ادب کے سماج سے تعلق پر سنجیدہ بحث کا آغاز کیا۔ چوتھا اثر سیاسی شعور کی بیداری تھا؛ قیامِ پاکستان سے قبل ان تحریروں نے سامراج کے خلاف ذہن سازی کی اور آزادی کے بعد بھی یہ تحریک مزدوروں، کسانوں اور طلبہ کی تحریکوں سے جڑی رہی۔ پانچواں اثر یہ کہ ترقی پسند فکر نے اردو ادب کو عالمی ادب سے جوڑا؛ تراجم، کانفرنسوں اور بین الاقوامی رابطوں سے اردو ادیب دنیا کے بڑے ادبی مباحث کا حصہ بنا۔

ترقی پسند نقطۂ نظر پر تنقید

متوازن تبصرہ تنقید کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ ترقی پسند مصنفین پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا گیا کہ انہوں نے ادب کو نظریے کے تابع کر دیا؛ جب ایک مصنف پہلے سے طے شدہ سیاسی نتائج کو کہانی میں ثابت کرنے نکلتا ہے تو فن کی سچائی اور کردار کی فطری نشوونما مجروح ہوتی ہے اور تحریر نعرے بازی میں ڈھل جاتی ہے۔ ناقدین کے مطابق اوسط درجے کے ترقی پسند ادب میں سرمایہ دار ہمیشہ ظالم اور مزدور ہمیشہ فرشتہ دکھایا گیا، جو زندگی کی پیچیدگی کی نفی ہے۔ دوسرا اعتراض یہ ہے کہ طبقاتی کشمکش کو واحد محرک مان لینے سے انسانی زندگی کے مذہبی، روحانی اور نفسیاتی پہلو نظر انداز ہو گئے؛ برصغیر کے عام آدمی کی زندگی میں مذہب کا جو مرکزی کردار ہے، ترقی پسند ادب اسے عموماً فرسودگی کہہ کر رد کرتا رہا، جس سے اس کی عوامی قبولیت محدود ہوئی۔

تیسرا اعتراض تنظیم سازی اور سیاسی وابستگی پر ہے۔ تحریک کا ایک بڑا حصہ کمیونسٹ پارٹی کے اتنا قریب ہو گیا کہ ادبی فیصلے بھی سیاسی لائن کے تابع نظر آنے لگے، اختلافِ رائے رکھنے والوں کو رجعت پسند کہہ کر الگ کر دیا گیا اور منٹو جیسے بڑے مصنف کو خود تحریک کے بعض حلقوں نے فحاشی کے الزامات کی بحث میں تنہا کر دیا، حالانکہ منٹو نے کسی لائن کی پابندی قبول نہیں کی تھی۔ چوتھا اعتراض یہ کہ تحریک نے مذہب اور مشرقی تہذیبی اقدار کو جتنی سہولت سے رد کیا، خود پاکستان کی نئی ریاست سازی میں اس کا مؤقف غیر واضح رہا؛ 1947 کے بعد انجمن پر پابندیوں اور مصنفین کی گرفتاریوں (1951 کی سازش کیس میں فیض وغیرہ) نے بھی تحریک کا منتشر ہونا تیز کر دیا۔ ان اعتراضات کے باوجود یہ کہنا درست نہیں کہ تحریک محض سیاسی پروپیگنڈا تھی؛ اس کے بہترین مصنفین نے نظریے کو فن میں ڈھالا اور جو تحریریں نعرے سے آگے بڑھیں وہ آج بھی زندہ ہیں۔

نتیجہ

تبصرے کا خلاصہ یہ ہے کہ ترقی پسند مصنفین کا نقطۂ نظر اپنے عہد کی سب سے جاندار ادبی فکر تھی: اس نے ادب کو زندگی سے جوڑا، مظلوم طبقوں کو آواز دی، سامراج و جاگیرداری کے خلاف شعور بیدار کیا اور اردو افسانے و شاعری کو نئے موضوعات و اسالیب سے مالا مال کیا۔ اس کی کمزوری یہ تھی کہ جہاں یہ فکر سیاسی نظریے کی اسیر ہوئی وہاں فن پیچھے رہ گیا اور زندگی کی مذہبی و روحانی جہتیں مناسب جگہ نہ پا سکیں۔ حقیقی جائزہ یہی ہے کہ آج کا اردو ادب، چاہے ترقی پسند کہلائے یا نہ کہلائے، ترقی پسندوں کے کھولے ہوئے دروازوں سے گزر کر آیا ہے؛ سماجی حقیقت نگاری، احتجاج اور انسانی انصاف کی تلاش اب اردو ادب کی مستقل شناخت ہے اور یہی اس تحریک کی سب سے بڑی اور پائیدار کامیابی ہے۔

سوال نمبر 5: مسلح افواج کی تنظیمِ نو اور لیاقت علی خان کی تجاویز (20 نمبر)

سوال نمبر 5: مسلح افواج کی تنظیمِ نو کے بارے میں لیاقت علی خان کی تجاویز کیا تھیں اور انہیں کیوں مسترد کیا گیا تھا؟ بحث کریں۔ (20)

تعارف

تقسیمِ ہند کے فیصلے سے پہلے ہی مسلم لیگ کی قیادت کو یہ اندازہ تھا کہ اگر برصغیر تقسیم ہوتا ہے تو اس کی کامیابی یا ناکامی کا بڑا انحصار مسلح افواج کی تقسیم پر ہو گا، کیونکہ جس قوم کے پاس اپنی منظم فوج نہ ہو وہ آزادی کے فوراً بعد کے انتشار میں اپنے وجود کا دفاع نہیں کر سکتی۔ اسی پس منظر میں اپریل 1947 میں لیاقت علی خان نے، جو اس وقت عبوری حکومت کے رکن اور مسلم لیگ کے اہم ترین رہنما تھے، وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو مراسلے بھیجے اور انڈین آرمڈ فورسز کے لیے مقررِ دفاعی کمیٹی میں باقاعدہ مقالہ (paper) پیش کیا، جس میں مسلح افواج کی تنظیمِ نو کو اس انداز سے کرنے کی تجاویز دی گئیں کہ ضرورت پڑنے پر ان کی منصفانہ تقسیم ممکن ہو سکے۔ یہ تجاویز بروقت اور دور اندیش تھیں، مگر انہیں باقاعدہ مسترد کر دیا گیا۔

اس سوال کے دو حصے ہیں: پہلے لیاقت علی خان کی تجاویز کی تفصیل بیان کی جائے گی، پھر ان وجوہات پر بحث ہو گی جن کی بنا پر برطانوی حکام، کانگریس کی قیادت اور فوجی قیادت نے انہیں قبول کرنے سے انکار کیا۔ اس بحث کی اہمیت یہ ہے کہ اس سے تقسیم کے آخری مہینوں کی سیاسی چال بازیوں کی حقیقت واضح ہوتی ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پاکستان کو ورثے میں ملنے والی فوجی تنظیمِ نو کا عمل اتنا ادھورا اور متنازع کیوں رہا کہ اس کے نقصانات قیامِ پاکستان کے بعد بھی مہاجرین کی حفاظت، کشمیر کی جنگ اور فوجی اثاثوں کی تقسیم کی صورت میں سامنے آتے رہے۔

پس منظر: تنظیمِ نو، قومیانا اور افسر کیڈر کا عدم توازن

1947 کے آغاز میں برطانوی ہند کی مسلح افواج دو بڑے عمل سے گزر رہی تھیں۔ ایک تو دوسری جنگِ عظیم کے لیے بھرتی ہونے والی بڑی فوج کو سکڑا جا رہا تھا، دوسرے برطانوی افسروں کی جگہ ہندوستانی افسروں کو ترقی دینے کا عمل، جسے قومیانا (Indianisation) کہا جاتا ہے، جاری تھا۔ اس عمل میں تینوں سروسز، بری، بحری اور فضائی، کے چیفس، پرنسپل اسٹاف افسروں اور سینئر کمانڈروں کے انتخاب کے فیصلے ہونے تھے۔ مسئلہ یہ تھا کہ افسر کیڈر میں، خصوصاً سینئر عہدوں پر، ہندو افسروں کی بھاری اکثریت تھی اور مسلمان افسر نسبتاً کم اور نچلے درجوں پر تھے؛ انتخابی بورڈوں میں بھی اسی اکثریت کا وزن تھا اور نامناسب قرار دے کر بہت سے موزوں مسلمان افسروں کو ریگولر کمیشن سے محروم کیے جانے کی شکایات عام تھیں۔

لیاقت علی خان کی تشویش یہ تھی کہ اگر اسی عدم توازن کے ساتھ پورے ہندوستان کی افواج کو ایک ہی واحد فوج (single force) میں منظم کر دیا گیا اور اعلیٰ کمان غیر مسلم اکثریت کے ہاتھ میں چلی گئی تو سیاسی تقسیم کی صورت میں مسلمانوں کا حصہ کاغذی ثابت ہو گا اور نئے پاکستان کے پاس اپنی کمان ہی نہیں ہو گی۔ دوسری جانب جی ایچ کیو میں بعض خالص مسلم یونٹوں کو انہی مہینوں میں تحلیل (disband) بھی کیا جا رہا تھا، جس سے لیگی قیادت کے خدشات اور بڑھ گئے۔ قائداعظم بھی اس موقف کے حامی تھے کہ دفاعی افواج ہر قیمت پر تقسیم ہونی چاہئیں اور پاکستان و ہندوستان اپنے دفاع کے ذمہ دار ہونے چاہئیں؛ کسی ایسی مرکزی تنظیم کو وہ قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے جو پورے برصغیر کے دفاع کو ایک ہی ادارے کے تحت رکھے۔

لیاقت علی خان کی تجاویز

لیاقت علی خان نے 7 اپریل 1947 کو ماؤنٹ بیٹن کے نام اپنے مراسلے میں پہلی بنیادی تجویز یہ پیش کی کہ مسلح افواج کی جاری تنظیمِ نو اور قومیانے کا عمل اس انداز میں کیا جائے کہ افواج مستقبل میں تقسیم کے لیے تیار رہیں۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ قومیانے کا مقصد ایک ایسی ہندوستانی فوج بنانا ہے جو 1939 کی طے شدہ حد سے آگے نہ جائے اور برطانوی افسروں و جوانوں کی جگہ لے سکے؛ مگر اگر یہ سارا عمل ایک واحد فوج کے تصور پر مکمل کر لیا گیا تو ہندو افسروں کی اکثریت کی وجہ سے سارا ہندوستان عملاً غیر مسلم کنٹرول میں چلا جائے گا۔ لہٰذا ناگزیر ہے کہ تنظیم اس طرح ہو کہ وقت آنے پر فوج کی تقسیم ممکن ہو، یعنی یونٹوں کی تشکیل، افسروں کی تعیناتی اور اثاثوں کا حساب اسی امکان کو سامنے رکھ کر رکھا جائے۔

دوسری تجویز اعلیٰ تقرریوں سے متعلق تھی: تینوں سروسز کے سربراہوں، پرنسپل اسٹاف افسروں اور دیگر سینئر افسروں کے انتخاب میں اس توازن کو مدنظر رکھا جائے کہ مسلمان افسروں کو ان کا جائز حصہ ملے، تاکہ اعلیٰ کمان میں مسلمانوں کی نمائندگی صفر نہ ہو جائے۔ تیسری اور سب سے عملی تجویز 13 اپریل 1947 کے دوسرے مراسلے میں آئی جس میں انہوں نے اصرار کیا کہ سب سے پہلا اور اشد ضروری کام مسلح افواج کی تقسیم کا باقاعدہ منصوبہ (plan) تیار کرنا ہے، کیونکہ منصوبے کے بغیر آخری وقت میں تقسیم افراتفری کا سبب بنے گی۔ چوتھی تجویز اسی سلسلے کی کڑی تھی: لیاقت علی خان نے انڈین ڈیفنس کمیٹی میں انڈین مسلح افواج کی بانٹ کی تیاریوں کے منصوبے کے عنوان سے باقاعدہ مقالہ پیش کیا جس میں مطالبہ تھا کہ تقسیم کی تیاریوں پر کام فوراً شروع کیا جائے اور اس مسئلے کو سیاسی فیصلے کے اعلان کا انتظار کیے بغیر زیرِ غور لایا جائے۔

جدول 1: لیاقت علی خان کی تجاویز اور ان کا مقصد

تجویز	مقصد
تنظیمِ نو تقسیم کے امکان کے مطابق ہو	واحد فوج بن کر مسلمانوں کا حصہ ختم نہ ہو جائے
اعلیٰ تقرریوں میں مسلم نمائندگی کا توازن	اعلیٰ کمان میں مسلمان افسروں کا جائز حصہ
تقسیم کا باقاعدہ منصوبہ سب سے پہلے تیار ہو (13 اپریل 1947 کا مراسلہ)	آخری وقت کی افراتفری سے بچاؤ
ڈیفنس کمیٹی میں تیاریوں کے منصوبے کا مقالہ (25 اپریل 1947)	سیاسی فیصلے سے پہلے عملی تیاری کا آغاز

تجاویز کیوں مسترد کی گئیں: برطانوی مؤقف

ان تجاویز کے مسترد ہونے کی وجوہات میں پہلی وجہ خود وائسرائے کا مؤقف تھا۔ 8 اور 9 اپریل 1947ء کی ملاقاتوں میں ماؤنٹ بیٹن نے قائداعظم پر زور دیا کہ وہ جون 1948 تک ہندوستان کے امن و امان کا ذمہ دار ہے اور جب تک یہ ذمہ داری اس پر ہے اس کا قطعاً کوئی ارادہ نہیں کہ انڈین آرمی کی اہلیت (efficiency) یا حوصلے (morale) کو کمزور کرے؛ فوج کی تقسیم کی بات سے، اس کے خیال میں، تنظیم بکھر جائے گی۔ البتہ وہ اس حد تک مان گیا کہ تینوں سروسز ایک مرکزی ادارے کے تحت رہیں گی جس کا صدر وہ خود ہو گا، یعنی برطانوی نگرانی میں وحدتِ فوج برقرار رہے گی۔ برطانوی چیفس آف اسٹاف کی اپنی رپورٹوں میں بھی یہی سوچ ملتی ہے کہ منقسم ہندوستان کو اقتدار منتقل کرنا پڑے تو افواج کی تقسیم کا اعلان انتقالِ اقتدار سے پہلے نہ کیا جائے، کیونکہ متحد طاقت ور انڈین آرمی برطانوی دولتِ مشترکہ کے اسٹریٹجک مفادات کے لیے اہم تھی۔

دوسری وجہ فوجی قیادت کی مخالفت تھی۔ کمانڈر انچیف فیلڈ مارشل آکنلک نے 14 اپریل کو لیاقت علی خان کا خط دیکھنے کے بعد تبصرہ کیا کہ اگر اس مرحلے پر فوج کو تقسیم کرنے کا اشارہ بھی دیا گیا تو اس کے اثرات نہایت خوفناک ہوں گے اور سفارش کی کہ موجودہ انتظامات جون 1948 تک برقرار رکھنے کا اعلان کر دیا جائے۔ اس نے یہاں تک کہا کہ انڈین مسلح افواج کو دو خود کفیل حصوں میں تقسیم کرنا ممکن ہی نہیں۔ ان کے نزدیک فوج کی پیشہ ورانہ وحدت ہر سیاسی مطالبے سے بالاتر تھی، حالانکہ یہ نظر انداز کر دیا گیا کہ وہ

وحدت خود ایک ایسے سیاسی انتظام کی محافظ تھی جو ختم ہونے جا رہا تھا۔ تیسری وجہ عبوری حکومت کے وزیرِ دفاع سردار بلدیو سنگھ کا انکار تھا؛ 25 اپریل 1947 کو ڈیفنس کمیٹی نے لیاقت علی خان کے مقالے پر بحث شروع کی تو بلدیو سنگھ نے اس میں بیان کردہ تجاویز کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

کمیٹی کے فیصلے اور کانگریس کا رویہ

ڈیفنس کمیٹی نے باضابطہ طور پر جو فیصلے کیے وہی دراصل تجاویز کے مسترد ہونے کی دستاویزی صورت ہیں۔ اول یہ کہ افواج کی تقسیم کا مسئلہ اس وقت تک کابینہ کے سامنے نہ لایا جائے جب تک برصغیر کی سیاسی تقسیم کا فیصلہ نہیں ہو جاتا؛ یعنی پہلے مسئلے کو موخر کرو اور پھر وقت کی کمی کا بہانہ بناؤ۔ دوم یہ کہ کمانڈر انچیف اس مسئلے کو چھوٹی ذیلی کمیٹیوں میں اس انداز سے رکھے کہ اس کے چیدہ نکات صرف سیاسی فیصلے کے اعلان کے بعد زیرِ بحث آئیں۔ سوم یہ کہ مسلح افواج کے قومیانے کا عمل فی الحال معطل کر دیا جائے اور سیاسی فیصلے کا انتظار کیا جائے، تاکہ افواج کی بانٹ کا معاملہ خود برصغیر کی بانٹ کو التواء میں نہ ڈال دے۔ ان فیصلوں سے کانگریس کے سیاسی ارادے بھی ظاہر ہوتے ہیں: اس کی قیادت متحد فوج کو متحد ہندوستان کے آخری امکان اور پاکستان کے انحصار کی ضمانت کے طور پر دیکھتی تھی۔ کرشنا مینن نے ماؤنٹ بیٹن کو یہ تک کہا کہ اگر سیاسی تقسیم پہلے ہوئی اور فوج کی بانٹ بعد میں، تو بھی کانگریس کی حکمتِ عملی یہ ہو گی کہ پاکستان کو فوج کی شروعات صفر سے کرنی پڑے اور تمام مسلمان فوجیوں کو یونین سے فارغ کر دیا جائے۔

یہاں اس سوال پر بھی بحث ضروری ہے کہ انکار کے محرکات میں محض انتظامی احتیاط تھی یا سیاسی مفاد بھی۔ شواہد سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں چیزیں ملی ہوئی تھیں: برطانوی فوجی قیادت کے لیے پیشہ ورانہ وحدت اور حوصلے کے دلائل حقیقی تھے، لیکن اسی دوران اسلحہ ڈپوؤں کو مسلمان اکثریتی علاقوں سے خالی کروانے اور مسلم یونٹیں تحلیل کرنے جیسے اقدامات ظاہر کرتے ہیں کہ زمینی سطح پر تقسیم کی تیاری اس سمت میں ہو رہی تھی جو پاکستان کے مفاد میں نہیں تھی۔ اسی طرح سیاسی سطح پر فوج کی وحدت کی بات پاکستان پر دباؤ کا ذریعہ بھی بنی کہ وہ کمزور مرکز یا مشترکہ دفاعی انتظام قبول کر لے۔ لیاقت علی خان کی تجاویز اس لیے بھی مسترد ہوئیں کہ وہ اسی دباؤ کو ختم کر دیتی تھیں؛ اگر تقسیم کا منصوبہ اپریل میں بن جاتا تو پاکستان ایک مکمل فوج کے ساتھ آزادی کا دن دیکھتا۔

بعد کا نتیجہ اور نتیجہ بحث

تاریخ نے لیاقت علی خان کے مؤقف کو درست ثابت کیا۔ تین جون 1947 کے منصوبے کے بعد جب سیاسی تقسیم کا فیصلہ ہو گیا تو افواج کی تقسیم بالآخر شروع کرنا پڑی؛ پارٹیشن کونسل کے تحت آرمڈ فورسز کی کانسٹی ٹیوشن کمیٹی بنی اور آکنلک کو دونوں ممالک کا سپریم کمانڈر بنایا گیا، مگر وقت اتنا کم رہ گیا تھا کہ فوجی اثاثوں کی تقسیم ادھوری رہی، پاکستان کو اس کا طے شدہ حصہ مکمل نہ ملا، سپریم کمانڈر کا دفتر بھارتی دباؤ پر 30 نومبر 1947 کو بند کر دیا گیا اور ریڈ کلف ایوارڈ کے تاخیر سے اعلان کی وجہ سے فوج سرحدوں پر بروقت تعینات نہ ہو سکی، جس کا خمیازہ مہاجر قافلوں اور سرحدی آبادیوں نے بھگتا۔ یہ نقصانات دراصل انہی تجاویز کے مسترد کیے جانے کی قیمت تھے جن میں بروقت منصوبہ بندی کی بات کہی گئی تھی۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ لیاقت علی خان کی تجاویز چار نکات پر مشتمل تھیں: تنظیمِ نو کو تقسیم کے امکان کے مطابق ڈھالنا، اعلیٰ تقرریوں میں مسلم نمائندگی کا توازن، تقسیم کا باقاعدہ منصوبہ سب سے پہلے تیار کرنا اور ڈیفنس کمیٹی کے ذریعے تیاریوں کا آغاز۔ انہیں ماؤنٹ بیٹن نے وحدتِ فوج اور امن و امان کی دلیل سے، آکنلک نے اہلیت و حوصلے اور ناممکن ہونے کے دعوے سے، بلدیو سنگھ اور ڈیفنس کمیٹی نے سیاسی فیصلے کے انتظار کے بہانے سے اور کانگریس نے متحد فوج کو سیاسی دباؤ کے آلے کے طور پر برقرار رکھنے کی خواہش سے مسترد کیا۔ یہ واقعہ برصغیر کی تقسیم کی ان ناانصافیوں میں سے ہے جنہوں نے پاکستان کو اس کے قیام کے پہلے دن سے دفاعی مشکلات میں ڈال دیا، اور لیاقت علی خان کی دور اندیشی کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ مئی و جون 1947 میں ہر وہ بات ناگزیر ثابت ہوئی جو انہوں نے اپریل میں کہی تھی۔